ڈاکٹر عقیلہ جاوید

خواجہ حسن نظامی: عوامی انشا پرداز

The writer of "Karbal Katha" (Fazal Ali Fazalie) consider to be the first writer who started "Dehlvi Nasar". For preferable knowledge to Indian people Difficult books and words has been translated in understandable and meaningful words. In 1800 Fort William College makes the whole procedure easier for the people of India. Different writers were nominated for this purpose. One of the big name was "Khawaja Hassan Nizami" Allama Muhammad Iqbal (the great poet) start writing this name, even today this name is famous. In Jan 1946, Govt. of India gave the title of "Shamsh ul Ulma") to him. This great writer was born in Dehli, got his early education in Madrussahs. He wrote his first article for the India and published in Indian gazette.Khawaja Hassan Nizami wrote more than hundred books and papers. He started different gazette, magazines and newspapers on daily, weekly and monthly basis for the people of India. He devoted his whole life for the education of Indian people. For this he published his magazine "Minadee" in 1926 and audit for long period. He was brilliant sketch writer, he wrote the sketch of "God". This great personality died in 1955 in Dehli.

دہلوی نثر کے مزاج کی تشکیل فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' سے ہوتی ہے۔ ''کربل کتھا'' واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہدا'' کا اردو میں آزاد ترجمہ ہے۔ چوں کہ یہ مذہبی ضرورت کے تحت عام لوگوں کے لئے لکھا گیا اس لئے اس میں فارسی تراکیب اور عربی کے موٹے موٹے محاوروں کو نظر انداز کر کے عام فہم انداز اپنایا گیا۔ آگے چل کر اسی عام فہم انداز نے دہلوی نثر کا مزاج متعین کیا اور جب ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں سخن آرائی و خود نمائی سے ہٹ کر خالصتاً ہندوستانی بول چال کی زبان میں نصابی کتب تیار کرانے کے لئے چوبیس ادیبوں کا تقرر ہوا تو ان میں سے پندرہ ادیبوں کا تعلق دلی سے تھا۔ لہٰذا دہلوی نثر کی سب سے ابتدائی خصوصیت یہ طے پائی کہ تحریر تقریر سے قریب تر ہو۔ دہلوی نثر میں روزمرہ اور عام بول چال سے بہت قریب نثر لکھنے والوں میں ایک بڑا نام خواجہ حسن نظامی کا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا نام سید علی حسن عرف حسن نظامی تھا۔ علامہ اقبال نے خواجہ حسن نظامی لکھنا شروع کیا اور آج اسی نام کو مقبولیت حاصل ہے۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں انہیں حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب دیا گیا جب کہ مصورِ فطرت، امام

الشائخ عوامی خطابات ہیں۔

خواجہ حسن نظامی ۲؍محرم ۱۲۹۶ھ (بمطابق ۸۰-۱۸۷۹ء) میں بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ سید عاشق علی نظامی اور والدہ کا نام سیدہ چہیتی بیگم تھا۔ خواجہ صاحب گیارہ سال کے تھے کہ ماں باپ دونوں کا ایک ہی سال کے اندر انتقال ہوگیا اور بڑے بھائی سید حسن علی شاہ نے ان کی سرپرستی کی۔ ابتدائی تعلیم بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں حضرت مولانا اسمٰعیل کاندھلوی، مولانا محمد میاں کاندھلوی اور مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ سال تک گنگوہ میں مولانا رشید احمد صاحب کے مدرسے میں تعلیم پائی۔ گنگوہ سے واپسی پر اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے چچا سید معشوق علی کی صاحبزادی سیدہ حبیب بانو سے شادی ہوئی۔ چند سال بعد پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ دوسری شادی ۱۹۱۶ء میں سیدہ محمود خواجہ بانو سے ہوئی۔

خواجہ صاحب نے پہلا مضمون ''انڈیا کی نازک حالت'' کے عنوان سے ''انڈیا گزٹ'' بمبئی میں لکھا۔ پھر ''پیسہ'' اخبار لاہور، وکیل، امرتسر، سر عبدالقادر کے مخزن وغیرہ میں مسلسل لکھتے رہے۔ ۱۹۰۹ء میں پہلا رسالہ نظام الشائخ جاری کیا۔ ۱۹۱۳ء کے بعد خواجہ صاحب نے کتابیں لکھنے کی طرف توجہ کی اور چھوٹی بڑی کئی سو کتابیں اور رسالے تصنیف و تالیف کئے۔ متعدد روزانہ، دو وقتہ، سہ روزہ، ہفتہ وار، ماہانہ اخبار و رسائل جاری کئے۔ رسالہ ''منادی'' ۱۹۲۶ء سے چھپنا شروع ہوا اور سب سے طویل مدت تک خواجہ صاحب نے اسی کو ایڈٹ کیا۔ ۱۰؍ذی الحجہ بمطابق ۳۱؍جولائی ۱۹۵۵ء کو خواجہ حسن نظامی نے رحلت فرمائی۔ اپنی قبر انہوں نے پچاس برس قبل بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نئی دہلی میں تیار کروا رکھی، اس میں دفن کیا گیا۔

خواجہ صاحب کی ذات بے شمار صفات کی حامل تھی وہ بیک وقت عالم، صوفی، معلم، مصلح، ادیب، مقرر اور تاجر تھے۔ انہوں نے بے شمار بزرگوں کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ ان کے پاس کتابی علم کے ساتھ ساتھ مشاہداتی علم بھی تھا۔ ایک دفعہ اپنے بڑے بیٹے خواجہ حسین نظامی جو انگریزی زبان و ادب پر عبور رکھتے تھے کہ بیٹا تم نے انگریزی پڑھی اور تمہارے باپ نے انگریز کو پڑھا ہے۔ ان کا مطالعہ انسانوں تک محدود نہ تھا بلکہ وہ اشیاء جو دوسروں کے نزدیک غیر اہم تھیں ان کے مطالعے کے نتیجے میں اہم ہو کر سامنے آتی ہیں مثلاً گھاس کے تنکے، دیا سلائی، مکھی، مچھر، آلو وغیرہ پر لکھ کر اپنے مشاہدے سے دوسروں کو مستفید کیا۔ خواجہ صاحب بیک وقت صوفی اور مفکر تھے، انہوں نے خاموش حجرے میں عبادت کرنے کی بجائے زندگی کی تگ و دو میں حصہ لیا۔ زندگی کی نعمتوں سے منہ موڑنے کی بجائے اس کی شیرینی و تلخی کو چکھا۔ یوں مشاہدے سے زیادہ تجربے سے گزرے، تب وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ گلاب کے مقابلے میں کیکر کا پھول بہتر ہے جو حوادث کا مقابلہ کر کے قائم رہتا ہے۔ گوشہ نشین صوفی جو مریدوں کی نذروں پر جیتا ہے اس سے بہتر وہ شخص ہے جو حلال روزی اور زندگی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیتا ہے محنت کرنا اور محنت کا درس دیتا ہے۔ خواجہ صاحب ایسے پیر تھے جو مریدوں کی معاشی پریشانیاں دور کرنے کے لئے دعا پر ہی انحصار نہیں کرتے تھے بلکہ مختلف پیشوں سے متعلق ایسا لٹریچر تیار کرا کے شائع کرتے تھے جس پر عمل کر کے لوگ اپنے معاشی مسائل خود حل کر سکتے تھے۔ مثلاً ان کی کتابیں حلوائی کی تعلیم، مرغی انڈے کا بیوپار، گھریلو دھوبی گھاٹ، فن انجینئری وغیرہ اسی جذبے کے تحت لکھی گئیں۔ کار زندگی میں عملی جدوجہد کے ساتھ ساتھ گویا مقصود کو اپنے کے لئے دعا کے ذریعے کو بڑی اہمیت دی۔ ۱۹۰۰ء میں ان کا ایک رسالہ شائع ہوا جس کا نام تھا ''مفلسی کا مجرب علاج بذریعہ دعا''۔ اس کے علاوہ ''اردو دعائیں'' کے نام سے رسالہ مرتب کیا۔ اردو میں دعائیہ لٹریچر ہمیں صرف خواجہ حسن نظامی کے ہاں ہی دکھائی دیتا ہے۔ ان دعاؤں میں دہلی زبان کا چٹخارہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مثلاً:

> ''دانا تو کہاں ہے؟ من کی بپتا کے دیکھی ہاں، سوئی سن اُلجھنوں میں ہوں، گردشوں میں ہوں، بے قراری دیکھ، آہ و زاری دیکھ، اشک باری بھی..... یہ رات کیوں کر کٹے، تو یا دآتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے اپنے

داس کو درشن دے، روپ دکھا، جلوہ فروز ہو، آنکھ بے ہوش ہو، من سنتوش ہو۔ کس کا بلقان، کیسا ایران، تیری رحمت کا چشمہ ہو، اس میں اشنان، اسی میں ہیں دونوں جہان، رین اندھیری، بدلی کالی، رستہ بھاری، دشمن سر پر، غفلت دل میں، ہاتھ پکڑ بھگوان...... سر ہے حاضر، کھینچے کٹاری، عشق کی اگنی چتا ہماری، ست پکاریں، ست بن جائیں، جزو کو تیاگیں، کل ہو جائیں، بیڑت پہنچیں، مکہ دیکھیں، بیچ سمندر جھنڈا گاڑیں، ...... تو ہو بس میں، سب ہوں بس میں، حسن فطائی کس کا بندہ؟ وقت کٹھن ہے الکا پھندا، بھگتی اپنی من کو دے بھارت سیوا سب کو دے۔ بس میں آ بھگوان۔ تیرے نام کو پرنام یا ذی العزۃ والجبروت والاکرام"

اِن دعاؤں میں گداز قلب کی دولت بیداری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خواجہ صاحب ایک وسیع النظر اور روشن خیالی صوفی تھے، انہوں نے دعاؤں کو ایک ایسا روپ دیا ہے جس میں خدا اور ایشور کا جلوہ ایک ہی نظر آتا ہے۔ قومی ایکتا اور مذہبی رواداری کی انہوں نے زندگی بھر تبلیغ کی۔ ''سیپارۂ'' میں ست اَلست کی دعا اس طرح مانگتے ہیں:

''تجھ کو داتا کہیں، تجھ کو سولا کہیں، تجھ کو داور کہیں، تجھ کو کیا کچھ کہیں تو ہر ہے اور ہر سے آزاد تو ہندو کا برہم اور اوم اور مسلمان کا اللہ، عیسائی کا گاڈ، سکھ کا اکال پورکھ، تو امیر اور غریب کو ایک نگاہ سے دیکھنے والا ہے۔ ہماری دعا اور پرارتھنا سن اور قبول کر''

خواجہ صاحب کی تصورِ دعا میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان کا حرکت میں برکت پر ایمان راسخ تھا وہ دعائے محض کے قائل نہیں تھے۔ بقول اُن کے'' میں اس قسم کے نکمے، سست اور بے کار مُفلسوں سے تنگ آ گیا ہوں جو رات دن صرف وظیفے پڑھتے رہتے ہیں اور حلال روزی کمانے کے لئے ہاتھ پاؤں سے محنت نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لیس الا انسان الا ما سعیٰ۔ انسان کو اس عالم اسباب دنیا میں کوشش کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

خواجہ صاحب نے بے شمار خاکے اور قلمی چہرے بھی لکھے اس سلسلے میں شاید ہی کوئی ہستی ان کے قلم کی زد میں نہ آتی ہو۔ فلمی ایکٹرسوں سے لے کر شیطان اور خدا تک کے خاکے لکھ ڈالے۔ خواجہ صاحب پر کئی دفعہ کفر کے فتوے بھی لگے لیکن اللہ میاں کا جو قلمی چہرہ انہوں نے لکھا اس میں ایسی فنی مہارت اور چابکدستی پائی جاتی ہے کہ کوئی مولوی ان کے خلاف فتویٰ نہ دے سکا۔ اس خاکے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''بے صورت کی ایک مورت ہے تارہ بھی نہیں، چاند بھی نہیں، سورج بھی نہیں، ہفت افلاک بھی نہیں، عرش و کرسی بھی نہیں، سمندر و پہاڑ بھی نہیں۔ بہتا ہوا دریا بھی نہیں۔ ششدر اور حیران کنارہ بھی نہیں۔ کوندنے والی بجلی بھی نہیں۔ گرجنے والا بادل بھی نہیں، جمادات بھی نہیں۔ نباتات بھی نہیں۔ حیوان بھی نہیں۔ انسان بھی نہیں وہ تو بس بے صورت کی ایک مورت ہے کیا وہ لیلیٰ کے چہرے کا حُسن ہے؟ کیا وہ مجنوں کی آہ و بکا ہے؟ کیا وہ شیریں کی میٹھی بات ہے؟ کیا وہ فرہاد کی کوہ کنی ہے؟ کیا وہ پھولوں سے بھری بہتے پانی میں اپنی شکل دیکھنے والی ہریالی ڈالی ہے؟ کیا وہ بل کھاتی ہوئی زلف ہے؟ کیا وہ سرمئی آنکھ ہے؟ یا آنکھوں کا گلابی ڈورا ہے؟ یا کیلی پلک ہے؟ یا گلابی رخسار ہے؟ یا لال ہونٹ ہے؟ یا موتی سا دانت ہے؟ یا چاہ زنخداں ہے؟ یا سرد ہے؟ یا قمری ہے؟ یا چکور ہے؟ یا چکوری ہے؟ ...... بے صورت کی ایک مورت ہے

سب صورتیں اس کی۔ سب حلیے اس کے۔ سب چہرے اُس کے۔ سب جلوے اس کے۔ سب روشنیاں اس کی۔ سب نور اس کے۔ سب اندھیرے اُس کے، سب سیرتیں اُس کی۔ سب خصلتیں اور جبلتیں اس کی بنائی ہوئی۔ اس کی بسائی ہوئی۔ اس کی پھیلائی ہوئی۔ سمندروں میں تلاطم اور طوفان۔ کناروں میں چپ چاپ خاموش اور حیران۔ کلیوں میں برقع پوش، کھلے ہوئے پھولوں میں پردے سے باہر ہر ایک کی نظر

سے ہم آغوش۔ بہتے ہوئے پانی میں اسی کے دریا دل کی روانی۔ سوکھی خاک کے ذروں میں اسی کی تشنہ لبی اور خشک سامانی۔ پھولوں میں اس کی جوت کانٹوں کی نوک میں اسکی کی کھٹک۔ پھر بھی وہ بے صورت کی ایک صورت ہے۔"

خواجہ صاحب کا اس صورت سے تعلق یقیناً محض رسمی نہیں الہتزالاضرور ہے۔

خواجہ صاحب ایک مبلغ بھی تھے لیکن ان کی تبلیغ کا بھی ایک خاص انداز تھا وہ اثباتی طرز فکر پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے قرآن مجید کو عام فہم اردو اور ہندی میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ ترجمے کے لئے انہوں نے ایسی زبان استعمال کی جو لفظی ہونے کے ساتھ بامحاورہ بھی تھی۔ دنیاوی علوم کی طرح مذہبی علوم کے افادی پہلو پر نظر رکھتے تھے۔ اس لئے وہ کسی بھی علوم کے تجزیے میں فلسفیانہ رنگ اختیار نہیں کرتے۔ وہ عوام کے لئے لکھتے ہیں اور خواص بھی اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

اگرچہ خواجہ حسن نظامی نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن عوام میں ان کی شہرت "غدر دہلی" کے واقعات اور بیگموں اور شہزادوں کے مصائب کی داستانوں کے ذریعے ہوئی۔ یہ داستانیں اتنی دل گداز اور اثر انگیز ہیں کہ بقول جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال:

> "علامہ اقبال کے حضرت خواجہ حسن نظامی سے گہرے مراسم تھے بلکہ ان کی ذات سے خاص محبت تھی، ایک دوبار جب میں علامہ کی معیت میں دہلی گیا تو (حضرت) نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دینے کے بعد مجھے حضرت کے ہاں لے گئے۔ بچپن میں مجھے حضرت کی تصانیف پڑھنے کی ترغیب بھی علامہ ہی نے دی۔ مجھے خوب یاد ہے جب میں حضرت کی تصانیف میں مغل شہزادیوں کی مفلوک الحالی کے متعلق پڑھا کرتا تھا تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے علامہ سے ذکر کیا کہ حضرت کا انداز تحریر غیر معمولی طور پر موثر ہے فرمانے لگے کہ حضرت دردمند ہیں اور ہر دردمند کا انداز تحریر موثر ہوا کرتا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجے میں لکھے گئے حکمران خاندان کی عبرتناک تباہی پر یہ افسانے جو "غدر دہلی کے افسانے" اور "بیگمات کے آنسو" کے نام سے کتابوں میں شامل ہیں۔ بکھرتی برباد ہوتی اور آنسو بہاتی معاشرت کے صحیح معنوں میں عکاس ہیں۔ غدر کے باعث شہزادوں اور بیگمات کی تاراجی و بربادی پر جو داستانیں خواجہ صاحب نے رقم کی ہیں، وہ انہیں عظمت اور ہمہ گیری عطا کرتی ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جو مرثیہ اور ماتم سے ہٹ کر ہیں لیکن انسان کے دل میں وہ کسک پیدا کرتے ہیں کہ بے اختیار دل سے آہ نکل پڑتی ہے۔ اسی سے ان کے مشاہدے کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مصائب و آلام سے بھرپور زندگیوں کے یہ افسانے رحم و عبرت کے جذبات انسانوں کے دل میں پیدا کرتے ہیں اور وقتی طور پر ہی سہی ہم کچھ دیر تک غمگینی کے تاثر کے زیر اثر رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے ایک گرجتے ہوئے انقلاب کی خوں آشامیاں دیکھی تھی۔ ایک معاشرے کو دم توڑتے دیکھا تھا۔ ان کے سامنے ایک سلطنت کا جھلملاتا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ ایک نئے دور نے جنم لیا لیکن خواجہ صاحب جس دور میں پیدا ہوئے تھے اس کی محبت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ لہٰذا نئے دور نے جہاں جہاں اور جس جس پر چرکے لگائے، خواجہ صاحب کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ خصوصاً مغلیہ افراد کے مصائب پر لکھتے ہوئے جو الفاظ کے خول میں گھٹی ہوئی چیخیں ہیں وہ اسی جذبے کی پیداوار ہیں۔ دلی اور اس کی لٹی ہوئی بہاراں کا وہ خاص موضوع تھا جس پر وہ عمر بھر لکھتے رہے۔ گویا دلی کی بربادی اور اس کے شاہی خاندان کی ابتری کا زخم ایسا زخم تھا جو ان کے سینے میں ہمیشہ ہرا رہا اور جس نے بیگمات کے آنسو، انگریزوں کے قصے، دلی کی آخری شمع، دلی کا آخری سانس، بہادر شاہ کا روزنامچہ وغیرہ نجانے کتنی ہی کتابیں لکھوا ڈالیں جو عبرت انگیز مضامین ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کے نثر پاروں کی مقبولیت کا ایک سبب ان کا اسلوب بیان بھی ہے ان کے اسلوب میں سادگی، بے تکلفی

اور بے ساختگی ہے۔ایک ایسا اسلوب بیان جو ہر ذہنی سطح کے آدمی کے لئے دلکشی رکھتا ہے۔خواجہ صاحب کا اسلوب سر سید احمد خان اور محمد حسین آزاد کے اسالیب کی درمیانی چیز ہے یعنی سر سید کی سادگی اور سلاست اور آزاد کی شگفتہ بیانی اور رنگیلا پن ان کے ہاں اکٹھے ہو گئے ہیں۔رواں، صاف اور سادہ نثر کو تشبیہات اور استعارات قدرے رنگین بنا دیتے ہیں۔خصوصاً ان کی مرقع کشی میں جو تشبیہات استعمال ہوئی ہیں۔وہ اُردو کی روایتی تشبیہات نہیں بلکہ خواجہ صاحب کی اپنی زندگی کی حقیقتیں ہیں مثلاً ماڈرن معشوق کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچتے ہیں:

> قد ایسا جیسا اخبار کا کالم، بال ایسے جیسے تنخواہوں کی تخفیف، پیشانی ایسی جیسے وہائٹ پیپر، بھویں ایسے جیسے اسمبلی ہال، پلکیں، لکھنے کا باریک رب۔ آنکھیں اکشا نمبروں کے ننھے ننھے دو گلاس۔ نگاہیں کنٹرو پیٹو گورنمنٹ کی پالیسی، رخسار بالشویک یا سرحدی سرخ پوش، ٹھوڑی، برٹش ڈپلومیسی۔ ہونٹ انگریزی کھانے کی لال جیلی، کمر ہندوستان کا اتفاق، بالوں کی کتر شامیانے کی جھالر۔ایسا ضدی جیسے پولیس کا سپاہی۔ایسا بے وفا جیسے دیسی لیڈر۔ایسا ہرجائی جیسے تمباکو اور ایسا منہ چڑھا جیسے چائے کی پیالی، چلتا تو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا، دیکھتا ہے تو خوردبین بن جاتا ہے بولتا ہے تو پیانو معلوم ہوتا ہے۔

اس مختصر نثر پارے میں جہاں گردوپیش کی زندگی کا غیر معمولی علم ہے وہاں تخیل کی بلند پروازی اور حسنِ انتخاب ہے جہاں شگفتگی اور طنز و مزاح ہے وہاں ہم عصر زندگی کے سماجی حالات پر تبصرہ بھی پایا جاتا ہے۔ان کی نثر کے بنیادی عناصر زبان پر عبور، علم اور قوتِ مشاہدہ ہیں اس کے لئے انہیں عربی، فارسی کے غیر مانوس الفاظ کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بلکہ ان کے نوکِ قلم سے نکلنے والے الفاظ بھی ہندی ہوتے ہیں سنسکرت کے الفاظ کا بے تکلف استعمال بھی ان کی خصوصیت ہے۔گویا ان کا ذہن جس ماحول میں پروان چڑھا اس کی عکاسی ان کی تحریر میں اُجاگر ہوتی ہے۔لہٰذا ہندی انداز بیان کو بڑے دلکش پیرایے میں پیش کیا ہے۔ان کے اسلوب میں ان کی شخصیت، ماحول، موضوع، مقصد اور مخاطب سب رنگ نمایاں جھلکتے ہیں۔انہیں زبان پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ جب چاہتے ہیں موضوع کو چند سطروں میں سمیٹ لیتے ہیں اور جب بات کو طول دینا چاہتے تو بات سے بات پیدا کرنے کا وہ ڈھنگ جانتے ہیں کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے۔مجموعی طور پر ان کے اسلوب بیان میں حسنِ ادا، سادگی، قطعیت، اختصار، زورِ بیاں، بذلہ سنجی اور گداز پایا جاتا ہے۔ان کے سیدھے سادے جملوں میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ نظر آتا ہے مثلاً ان کے ایک مضمون ''لا'' کی یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں:

> ''انگریزی زبان میں اس سر بلند لفظ کے معنی قانون اور ضابطے کے ہیں۔عرب والے انکار اور نفی کے وقت اس کا استعمال کرتے ہیں۔اہلِ اُردو تکمانہ طلب موقع پر ''لا'' بولتے ہیں.....عرب کا ''لا'' صور اسرافیل ہے انگریزی لا کی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں۔ایک ہی ضرب میں حکومت کے ''لا ک'' کو نیست و نابود کر سکتا ہے حکومت کے 'لا' کی بساط ہی کیا جو عربی 'لا' کے سامنے آ سکے۔''

اگر سادگی، بذلہ سنجی، زورِ بیان گداز طنز اور اختصار کو ایک جگہ دیکھنا چاہیں تو ''جھینگر کے جنازے'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''ایک دن اس مرحوم کو میں دیکھا کہ حضرت ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا۔ اُچھل کر بولا، ذرا اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔سبحان اللہ تم کیا خاک اس کا مطالعہ کرتے تھے۔بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔بولا، واہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتاب پڑھ لیتے ہیں مگر ان کو سمجھتے ہیں اور نہ عمل کرتے ہیں..... یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے ایک شخص ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔ جھینگر کی بات سن کر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا مار کر ہنسنے لگا واہ خفا ہو گئے، بگڑ گئے، لاجواب

ہو کر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔''

خواجہ حسن نظامی کے مخاطب چوں کہ عوام ہیں اس لئے ان کے یہاں فلسفیانہ موشگافیوں کے بجائے دلچسپ انداز اور دل میں اُتر جانے والی بات ہے۔ زبان پر ان کی مکمل گرفت ہے اور اپنے مخاطب کی نفسیات سے پوری طرح واقفیت کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے مدرسے میں تعلیم پا کر ذہنی بلوغ کو پہنچے تھے، اس لئے وہ انسانی فطرت کے ایک نہایت نکتہ رس شاہد و ناظر تھے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں میں رنگِ ظرافت بھی ایک انوکھی اور دل پذیر کیفیت پیدا کرتا ہے۔ ان کے ظریفانہ مضامین کا ایک مجموعہ ''چٹکیاں اور گدگدیاں'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ وہ الفاظ اور مواقع دونوں سے اپنا مواد حاصل کرتے ہیں۔ اس امتزاج سے وہ ایک نکھری ہوئی ظرافت کی دل آویز قسم سے متعارف کرواتے ہیں، اس کے پس منظر میں اکبر الہ آبادی کی صحبت بھی کارفرما ہو سکتی ہے، مولانا صلاح الدین کے بقول:

> خواجہ صاحب اگر شعوری طور پر اپنے عہد کے کسی اہلِ قلم و سخن ور سے متاثر ہوئے ہیں تو وہ جناب اکبر الہ آبادی ہیں۔ اکبر سے ملنے اور ان کی صحبت سے فیض پانے کے لئے وہ بار بار الہ آباد جاتے تھے اور مسلسل خط و کتاب جاری رکھنے میں بھی سعی بلیغ فرماتے تھے۔ انہوں نے اپنے دل پر اکبر کی شخصیت اور ان کے کلام کے تاثر کا بارہا اعتراف کیا اور اپنے اکثر نظریات کو اُن کی توجہ اور صحبت کا نتیجہ قرار دیا۔ اکبر کے استائل کی سادگی اور نوکیلے پن کا سراغ ان کی اپنی نظموں کے بعد اگر کسی اور جگہ تلاش کیا جائے تو وہ خواجہ صاحب کے نثر پاروں میں ہی ملے گا۔''

دوسری طرف چوں کہ خواجہ صاحب کے لکھے ہوئے افسانے اور کہانیاں زیادہ تر انقلاب ۱۸۵۷ء کی بپتا سے متعلق ہیں اس لئے ان میں سوز و گداز کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے، اس حوالے سے ان کا اسلوب ملاحظہ فرمائیں:

> ''درگاہ حضرت چراغ دہلیؒ کے ایک گوشے میں ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت ہائے ہائے کر رہی تھی۔ سردی کا مہینہ دھواں دھار برس رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں اس عورت کا بستر تھا..... یہ عورت سخت بیمار تھی۔ پسلی کے درد، بخار اور بے کسی میں اکیلی پڑی تڑپتی تھی۔ بخار کی بے ہوشی میں اس نے آواز دی۔ نگبدن۔ اری او نگبدن! مر دار مر گئی۔ جلدی آ اور مجھ کو دوشالہ اوڑھا دے۔ دیکھ بوچھاڑ اندر آتی ہے۔ پردے چھوڑ دے روشنک تو ہی آ نگبدن تو کہیں غارت ہو گئی۔ میرے پاس کوئلوں کی انگیٹھی لا۔ پسلی پر تیل مل ارے درد میرا سانس رکا جاتا ہے۔ جب کوئی اس آواز پر بھی اس کے پاس نہ آیا تو اس نے کمبل چہرے سے ہٹا اور چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے لان میں خاک کے بچھونے پر تنہا پڑی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مینہ سناٹے سے برس رہا تھا، بجلی چمکتی تھی تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دیتی تھی جو اس کے باپ کی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر اس عورت نے نعرہ مارا اور کہا ابا! میں تمہاری گل با نو ہوں۔ دیکھو اکیلی ہوں۔ اٹھو مجھے بخار چڑھ رہا ہے، آہ میری پسلی میں شدت کا درد ہو رہا ہے مجھے سردی لگ رہی ہے میرے پاس اس بوسیدہ کمبل کے سوا اوڑھنے کو کچھ نہیں ہے۔ میری اماں مجھ سے بچھڑ گئیں۔ میں محلوں سے جلاوطن ہو گئی۔ بابا اپنی قبر میں مجھے بلا لو۔ اچھی مجھے ڈر لگتا ہے۔ کفن سے منہ نکالو اور مجھ کو دیکھو، میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں۔ میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔
میرا چھپر کھٹ کیا ہوا؟ میرا دوشالہ کہاں گیا؟ میری سیج کدھر گئی؟

ہائے ہائے۔ اُٹھو جی کب تک سوؤ گے۔ ہائے درد۔ اُفوہ۔ سانس کیوں کر لوں؟

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا یہ قول خواجہ صاحب کے لئے حرفِ آخر ہے کہ:

"اُن کا سا البیلا انشاء پرداز اُردو میں نہ کوئی اُن کے زمانے میں پیدا ہو سکا اور نہ آج تک ہوا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں عوامی انشاء پرداز تھے، سارے سے زیادہ سوز کے مالک۔"

ماخذات

۱۔ خواجہ حسن نظامی، حیات اور کارنامے، مرتبہ خواجہ حسن ثانی نظامی، اُردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۷ء

۲۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی، آپ بیتی، خواجگان پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

۳۔ گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

۴۔ خواجہ حسن نظامی، بیگمات کے آنسو (مرتبہ ڈاکٹر عقیلہ جاوید، بیکن بکس ملتان) ۲۰۰۳ء

۵۔ خواجہ حسن نظامی، خاکے اور خاکہ نگاری، تالیف و تدوین ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۶۔ ماہنامہ آجکل (خواجہ حسن نظامی نمبر) فروری ۱۹۷۷ء۔